© rasailojaraid.com

منظور احمد

تبصرہ

’’سرسیّد احمد خان اور جدت پسندی‘‘[1]

بیسویں صدی کی آخری دہائی سے مغربی دُنیا کی خاص طور پر توجہ اسلام کی طرف مرکوز ہوئی ہے۔ یوں تو اسلامیات کے مطالعہ کو مہمیز دوسری جنگِ عظیم کے بعد ملی اور مغربی جامعات نے اس کے مطالعہ کو خاص طور پر اہمیت دی، لیکن اس کا رُخ عموماً اسلامی دُنیا کا معروضی مطالعہ نہیں تھا، بلکہ مغرب کے مفادات کے پس منظر میں مسلمانوں کی سیاسی اور ذہنی روش اور سرگرمیوں کا مطالعہ تھا، تاکہ ترقی یافتہ ملکوں کے مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ ایڈورڈ سعید کی کتاب ’مشرقیات‘ (Orientalism) اسلام پر مطالعہ کی اس جہت کو ظاہر کرتی ہے۔ مسلم مفکرین نے اس اثناء میں جو کام کیے ہیں، ان میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو چھوڑ کر، اکثر اگرچہ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں، لیکن زمانۂ جدید کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے کوئی قابلِ عمل اور جدید حل پیش نہیں کرتے۔ حسین نصر، اسلام کی اُس عالمگیریت کے موید ہیں، جو مذاہب کی قدرِ مشترک ہے اور دورِ جدید کی مادیت کے مقابلہ میں زندگی کی روحانی نقطۂ نظر کی وکالت کرتے ہیں۔ اس سلسلے کے دوسرے لوگ بھی جن میں اکثر نومسلم ہیں، جیسے فریتیف شون (Fritheof Schoun)، مارٹن لنگس (Martin Lings) اور رینے گینوں (Rene Guenon) وغیرہ، زمانۂ جدید کی جارح مادیت پرستی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف اسلامی جدیدیت نے اسلام کے ایک نئے طریقِ تفہیم پر زور دیا ہے، جس کو اب ہم بنیاد پرستی (Fundamentalism) کہنے لگے ہیں۔ یہ طریقہ تفہیمِ اسلام کو مذہب نہیں بلکہ نظامِ حیات کے طور پر پیش کرتا ہے اور اسلام کے اصل پیغام کو عملاً ریاستی قانون کے طور پر

(۱) محمد علی صدیقی: سرسید احمد خان اور جدت پسندی، ادارہ مطبوعات، کراچی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رائج کرنا چاہتا ہے۔ فی الوقت ان لوگوں پر جو مذہبی طرزِ فکر کے موید ہیں، اسلام کا یہ تصور غالب ہے۔ یہ تمام کوششیں اگرچہ ایک علمی پیش رفت کی نشاندہی کرتی ہیں، لیکن ان میں سے کسی نے اس بنیادی فکری ساخت پر بحث کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، جن پر یہ تمام نقطہ ہائے نظر قائم ہیں۔

تصوف زندگی کی روحانی اقدار پر زور دیتا ہے، لیکن دُنیا کے معاملات کو سلجھانے کے لیے اُس بنیادی ساخت کو نہیں چھیڑتا جس پر اسلامی قانون، معاش، اور معاشرت کا بنیادی نظام پچھلے چودہ سو سالوں میں قائم ہوا ہے۔ نتیجتاً یہ ساخت مع اپنے تمام ظواہر کے اسی طرح قائم و دائم رہتی ہے، جس طرح آج سے ہزار سال پہلے قائم تھی۔ اس صورتِ حال کے نتیجہ میں معاشرتی، سائنسی، قانونی اور فکری میدان میں جو تبدیلیاں آئی ہیں، اور ان کی وجہ سے جو مسائل انسان کی زندگی میں پیدا ہوئے ہیں، ان کے حل کی طرف کوئی پیش رفت ممکن نہیں ہو سکی ہے۔ اسی طرح بنیاد پرستی کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ وہ اس بنیادی ساخت پر نظرثانی کرنے کو تیار نہیں ہے جو اسلام کی دوسری اور تیسری صدی میں مستحکم ہوئی تھی اور جس نے اسلام کے عقائدی نظام کے ایک تجریجی سسٹم کی تخلیق کی تھی۔ اس بنیاد پر تحقیقی نظرثانی نہ کرنے کی وجہ سے وہ مسائل جوں کے توں رہتے ہیں جو ''اسلامی نظام کے برپا کرنے'' میں پیش آتے ہیں، اور جدید ذہن کو یہ نظام ناقابلِ عمل اور غیرِ عقلی نظر آتا ہے۔

برصغیر ہند میں میری نظر میں صرف تین مفکر ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اس بنیادی ساخت پر جو مذہبی فکری کی اساس کے طور پر کام کرتی ہے، بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں پہلے سرسیّدؒ، دوسرے اقبالؒ اور تیسرے فضل الرحمٰن ہیں۔ عصر حاضر کی فکر میں جس حد تک ممکن ہو سکا، ان تینوں نے اُس اساس کی طرف توجہ دِلائی ہے، جس پر اسلام کی تشکیلِ نو ممکن ہو سکتی ہے۔ ان تینوں کی مثالیں سامنے رکھ کر اب بھی متبادل منطقی نظام کی ماہیت پر مزید فکر اور تحقیق کی ضرورت ہے، جس کے بغیر عصر حاضر کے مسائل کا ممکنہ حل تلاش کرنا ممکن نہیں ہے۔

اِس وقت [illegible] سرسیّد احمد خاں کی فکری [illegible] جس پر ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

'سرسیّد احمد خاں اور جدت پسندی' کے نام سے ایک کتاب حال ہی میں شائع کی ہے۔ یہ کتاب وقت کی ضرورت بھی ہے اور برمحل بھی۔ ضرورت اِس وجہ سے ہے کہ جدید فکر کی تشکیل کا بنیادی مسئلہ سرسیّد نے ہی اُٹھایا تھا اور اس کا ایک ممکنہ حل پیش کیا تھا۔ اِس کتاب میں دس ابواب ہیں جو سرسیّد کی فکر کو مجملاً یکجا پیش کر دیتے ہیں۔ ضمیمہ جات اس کے علاوہ ہیں، جو اِس لیے بھی مفید ہیں کہ اُن کی تلاش میں آج کے قاری کو کئی دفتر کھنگالنے پڑیں گے۔

اِس کتاب کے مضامین سرسیّد کی مذہبی فکر، سیاست اور تعلیم سے متعلق ہیں۔ یہی موضوعات سرسیّد کے لیے اہم ترین تھے، اور ان ہی موضوعات سے مسلمانوں کا حال اور مستقبل وابستہ ہے۔ سیاست سے متعلق سرسیّد کا روّیہ، عملیت پسندی پر مبنی تھا۔ ان کی نظر میں وہی سیاسی روّیہ ٹھیک ہوسکتا تھا، جس میں مسلمانوں کی فلاح مضمر ہو۔ بے جا اور ناقابلِ عمل تصوریت ان کے نزدیک مسلمانوں کے کام نہیں آسکتی تھی۔ بلکہ وہ ان کی بقاء اور ترقی کے لیے مضر تھی۔ ان کی دانست میں مسلمان زمانی حقائق سے منہ موڑ کر، مجرد تصورات کی دُنیا میں زندہ تھے اور عظمتِ رفتہ کے خواب دیکھ کر، اس کی آرزو میں ایک رومانوی دنیا بسائے ہوئے تھے۔ اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق سرسیّد کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو ہر ایسے کام سے بچنا چاہیے جو برطانوی حکومت کے عناد کو دعوت دے، لیکن ساتھ ہی وہ ہر ایسے اقدام کے حامی تھے جس سے ہندوستان کی دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں کے حقوق کی بھی حفاظت ہو سکے۔ یہ کام انگریز دشمنی اور بغاوت کو ہوا دینے سے نہیں بلکہ خود کو قانون کا پابند ثابت کرنے، جدید تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ ایک بیدار قوم بنانے سے ہی ممکن ہوسکتا تھا۔ آج کے حالات میں بھی سرسیّد احمد خاں کی سیاسی فکر بڑی حد تک برمحل ہے۔ آج بھی مسلمان اگر اپنی حفاظت اور ترقی کرنا چاہتے ہیں تو لڑ کر نہیں، بلکہ بیداری اور علم کی طاقت کے ذریعہ کر سکتے ہیں۔ جس طرح سرسیّد کے زمانہ میں ان کے دلائل سے مسلمانوں کا ایک طبقہ مطمئن نہیں تھا، اسی طرح آج بھی اس قسم کی دلیلوں سے پاکستان کا ایک طبقہ مطمئن نہیں ہے۔ لیکن جو شے کل کی طرح آج بھی اہم ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان، چاہے آج کا ہو یا کل کا، جب تک عقل کی اساس پر جذبات سے اپنے اعمال وافعال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو متعین کرتا رہے گا، اسی وقت تک زیادہ عقل رکھنے والا اور زیادہ عیار ملک یا قوم اس کا استحصال کرتی رہے گی۔ آج کی جنگ جتنی مادی قوت اور زور بازو کی ہے، اتنی ہی ذہنی اور عقلی ہے۔ سر سیّد کے سیاسی نظریہ میں آج کے لیے ہوش مندی کا پیغام موجود ہے، جو وقت کی ضرورت ہے۔

سر سیّد کو اس بات کا احساس تھا کہ جس طرح مچھلی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، اسی طرح مسلمان مذہب کے بغیر بھی گزارہ نہیں کر سکتا، چاہے وہ اس کی تفہیم کسی طرح ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ دنیا میں عام طور پر اور مسلمانوں میں خاص طور پر معدودے چند ہی ایسے لوگ ہوں گے، جن کی زندگی پر مذہب کسی نہ کسی طرح اثر انداز نہ ہوتا ہو۔ سوال صرف یہ ہے کہ مذہب کی تفہیم کا کون سا راستہ اختیار کیا جائے؟ وہ جو انسان کو وقت کے کسی لمحہ میں منجمد کر دے اور زمانہ کی بدلتی فکر کے خلاف قوتِ مدافعت کھو دے یا وہ جو بدلے ہوئے حالات میں کوئی قابل عمل اور عقلی متبادل پیش کر سکے؟ سر سیّد اسی دوسرے نقطۂ نظر کے حامی تھے۔

انیسویں اور بیسویں صدی کی سائنسی فکر نے انسانوں کے ذہن میں ایسا انقلاب برپا کر دیا تھا، جس کے سامنے مذہب کے روایتی تصورات نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ سر سیّد نے اسی لیے سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی کہ ان تصورات کا جائزہ لے کر یہ سمجھا جا سکے کہ اسلام کس حد تک جدید خیالات کا انکار کیے بغیر قابلِ عمل بن سکتا ہے اور یہ کہ اسلام کی کیونکر ایسی تعبیر کی جا سکتی ہے جو ان حقائق کو جھٹلانے کی ضرورت کی قائل نہ ہو، جو سائنسی نقطۂ نظر سے ثابت ہوں اور عصری فہم جن کو قبول کر چکی ہو۔ اس سلسلے میں سر سیّد نے ایک بنیادی تصور یہ پیش کیا کہ خدا کے کلام اور خدا کے فعل میں فرق نہیں ہے۔ دونوں حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔ فطرت، خدا کا فعل ہے اور قرآن خدا کا کلام۔ اب اگر فطرت کا کوئی اصول ہمارے علم کا حصہ بن چکا ہے اور اس کی حقانیت ہمارے تجربے نے ثابت کر دی ہے، تو وہ اسی طرح محکم ہوگا، جس طرح خدا کا کلام۔ البتہ خدا کا کلام سمجھنے کے لیے زبان کی ضرورت ہوتی ہے اور زبان میں ادا کیے گئے جملے کے کئی معنی ممکن ہو سکتے ہیں۔ اس لیے اس کلام کے وہ معنی زیادہ قرینِ قیاس ہوں گے جو ہماری فہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں آئے ہوئے ایک فطری محکم اصول کے خلاف نہ ہوں۔ سرسیّد نے اپنے ایک مضمون 'مذہبی خیال زمانۂ قدیم اور زمانۂ جدید کا' جو تہذیب الاخلاق میں ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا، بیس (۲۰) اُصول اس طرح کے گنوائے ہیں جو قدیم اور جدید فہم کے اعتبار سے متغائر ہیں۔ اور اس بات پر زور دیا ہے کہ جدید اُصول چونکہ سائنسی فکر کے اعتبار سے انسانی علوم کا حصہ بن چکے ہیں، اس لیے اُن کو قدیم کے مقابلہ میں بطور متبادل قبول کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں قرآنی الفاظ کے مفہوم کی اگر کسی نئی تشریح کی ضرورت ہو تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی کتاب میں سرسیّد کی فکر کے دس بنیادی موضوعات پر علومِ جدیدہ اور عصری تاریخ کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور جزوی اختلافات کے باوجود، سرسیّد کی بنیادی فکر کی صحت کا اقرار کیا گیا ہے۔ بعض مسائل پر محاکمہ کے بعد سرسیّد کے نقطۂ نظر کے عصری پس منظر کو بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ مثلاً سرسیّد اور اکبر الہ آبادی کے اختلافات کو غیر ضروری اہمیت دے دی گئی تھی۔ اسی طرح سرسیّد کو انگریز کا وفادار ثابت کرنے کے لیے جن لوگوں نے الزامات کا انبار لگایا تھا، وہ سرسیّد کے منشاء کو سمجھنے میں غلطی ہی نہیں بلکہ بدگمانی کے مرتکب ہوئے تھے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا شکوہ بجا ہے کہ مسلم دانشوروں نے بحیثیتِ مجموعی سرسیّد کے خرد افروز تصورات کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز کیا، بلکہ وہ اسی قدامت پسند فکر سے وابستہ رہے جو کسی زمانہ میں مسلمان علماء نے حالات کی ضرورت کے تحت یونانی منطق کے زور پر پیش کی تھی۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی بجا طور پر خرد افروزی کی اسی فکر پر زور دیتے ہیں، جس کی ضرورت، آج سرسیّد کے زمانہ سے کسی طور پر کم نہیں ہے۔ مسلمانوں کے پاس آج جدید علم کا جو سرمایہ ہے، اس کا بڑا حصہ سرسیّد کا مرہونِ منت ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آج ہم سرسیّد کی فکر کو مِن وعَن قبول کر لیں۔ سرسیّد کے زمانہ میں علم کی سطح جس دانش کی طالب تھی، وہ اُنہوں نے فراہم کر دی۔ آج کے دانشور، عصری افکار کی روشنی میں اس میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں اور ان کو کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صدیقی کی کتاب کا مطالعہ اس اہم مسئلہ کو سامنے لانے کے لیے ضروری ہے۔

© rasailojaraid.com